تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

اگست ۲۰۲۱ء

تمام اہلِ پاکستان کو جشنِ آزادی مبارک

شمارہ ۹

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

جلد ۱

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

ماہ نامہ

مَفَاہِیْم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	آقا غلام ڈھونڈ رہے ہیں کہاں ہو تم	بلال مارہروی	۴
اداریہ	کھل گئے 'ابلیس' کے لشکر تمام	مدیر	۶
درس قرآن	ذکرِ الٰہی کی اقسام	مولانا محمد اقبال	۱۳
درس حدیث	قلبِ حزیں	ابنِ عباس	۱۶
	خاموش ہو جاؤ، تمھارا کوئی استاد نہیں!!	حافظ معاذ بن تجمل	۱۹
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۲)	صوفی جمیل الرحمن عباسی	۲۲
	چودہ اگست کا اصل خصوصی پیغام	انور غازی	۳۷
فقہیات	القواعد الفقهية: المشقة تجلب التيسير (۱)	مفتی نذیر احمد ہاشمی	۴۰
یسئلونک	یومِ عاشورا کا روزہ	فتاویٰ یسئلونک	۴۹
ادبیات	پاکستان کا اک مقصد تھا	اجمل سراج	۵۱

بلال مارہروی

ماخوذ: سہ روزہ الجمعیۃ، دہلی، ستمبر ۱۹۲۷

آقا غلام ڈھونڈ رہے ہیں کہاں ہو تم

رونق فزاے محفل کون و مکاں ہو تم
فرماں رواے مملکتِ دوجہاں ہو تم

ہستی تمھاری باعثِ تکوینِ دہر ہے
واللہ، کائنات کی روحِ رواں ہو تم

دنیا کے فیلسوف تمھیں کیا سمجھ سکیں
ہے ماوراے عقل وہ منزل، جہاں ہو تم

بوبکر اور علی ہیں اسی گلستاں کے پھول
جس گلستاں کے شاہ عرب؛ باغباں ہو تم

دنیا تمھارے جلووں کی آئینہ دار ہے
ہر چند چشمِ اہلِ جہاں سے نہاں ہو تم

پھر دینِ حق پہ یورشِ افواجِ کفر ہے
آقا غلام ڈھونڈھ رہے ہیں کہاں ہو تم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

کھل گئے 'ابلیس' کے لشکر تمام

مسلمان جتنا بھی گیا گزرا ہو، سورۃ الناس تو اسے بچپن سے یاد ہوتی ہے اور ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ کے الفاظ سے اتنا تو وہ سمجھتا ہے کہ شیطان جنوں کی طرح انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔ شیطان کے ان ایجنٹوں کو کہیں تو ﴿ذُرِّيَّتَهُ﴾ ''اس کی اولاد'' کہا گیا اور کہیں ﴿جُنُودُ إِبْلِيسَ﴾ '' ابلیس کے لشکری'' کہا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فوجِ ابلیس میں گھڑ سوار اور پیادے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کے سوار اور پیادے جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی، اور یہ وہ ہیں جو اس کی اطاعت کرتے ہیں''۔ شیطانوں کی اس فوج کی باہم پیغام رسانی کا بھی خاص اہتمام ہوتا ہے: ﴿شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (الانعام:۱۱۲) ''انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکا دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان عالی شان کے مطابق؛ ابلیس اپنا تخت سمندر پر بچھاتا ہے، پھر وہاں سے اپنے لشکر روانہ کرتا ہے جو انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ پھر اس کے چیلے واپس آکر اپنے اس گرو گھنٹال کو اپنی کارستانیاں سناتے ہیں۔ ابلیس اس '' بچۂ شیطان'' پر خوش ہوتا ہے جو بڑا فتنہ برپا کر کے آئے، لیکن ابلیس کا معیارِ شیطانی اتنا بلند ہے کہ جب بھی اس کا ایجنٹ اپنا کوئی کارنامہ پیش کرتا ہے تو وہ اس پر مطمئن

نہیں ہوتا: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا ’’ تونے توکچھ بھی نہیں کیا‘‘ کہہ کراسے مزید برانگیختہ کرتا ہے۔ پھر اس کا ایک چیلا آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام اور حرکتیں کیں یہاں تک کہ (فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ) ’’پھوٹ پڑگئی بندے اور اس کی بیوی کے درمیان‘‘، اس پر شیطان کِھل اٹھتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے اور اس بچۂ ابلیس کو گلے لگالیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

شرارت اور شیطانی کے کام بہت سارے ہیں لیکن ان میں سے چوٹی کا ابلیسی کارنامہ وہ ہے جس پر حدیث مندرجہ بالا میں ابلیس نے اپنے شیطونگڑے کو شاباش دی، میاں بیوی میں جھگڑا پیدا کرنا یا بہ الفاظ دیگر گھریلو اور عائلی زندگی میں فساد برپا کرنا۔ شیطانِ جن کا تخت تو پانی پر ہے، شیاطینِ انس کا ہیڈ کوارٹر، اگرچہ خشکی پر ہے لیکن ہے سمندروں کے بیچوں بیچ، انسانوں کو گمراہ کرنے والی پالیسیاں، قوموں کے اسی متحدہ مرکز سے جاری ہوکر ملکوں ملکوں قانون کا روپ لیتی ہیں۔ پھر ان ابلیسی طاقتوں کے سوار بھی ہیں اور پیادے بھی، نمائندے بھی اور سفیر بھی، یہ ہوسکتا ہے کچھ کی چاکری جان بوجھ کر ہو اور کچھ انجانے میں شیطان کے ایجنٹ بنے ہوں۔ یہ دلوں کی بات ہے جسے ہم دلوں کے مالک کی طرف لوٹاتے ہیں۔ ان طاقتوں کی حالیہ کارستانی ’’گھریلو تشدد کے خاتمے کا قانون ہے‘‘۔ اس قانون پر عرصے سے کام ہو رہا ہے۔ اسمبلیوں میں قانون سازی اور اسمبلیوں کے باہر ذہن سازی، کبھی عورت مارچ کے ذریعے اور کبھی کسی سیمینار کے ذریعے۔ کئی این جی اوز اور ویب سائٹس نے اس کارِ شر میں حصہ لیا۔ خیر؛ پنجاب، سندھ، بلوچستان، خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلیوں سے منظوری کے بعد یہ متنازع بل وفاقی حکومت کے ایوانِ بالا سے بھی منظور کرالیا گیا ہے۔ اس موقعے پر’’ یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں‘‘ کا عملی نمونہ دیکھنے کو ملا۔ تینوں بڑی سیاسی جماعتوں کے وہ اراکین جو، تو تکار اور جُوتم پیزار کا مظاہرہ عام طور پر کرتے رہتے ہیں۔ اس موقعے پر’’یک جان سہ قالب‘‘ نظر آئے اور باہمی کمالِ اتحاد و اتفاق کے ساتھ دینی جماعتوں کی شدید مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے یہ بل منظور کرلیا۔

ہم نے اس بل کا تعلق عالمی شیطانی تخت سے اس لیے جوڑا ہے کہ اس بل کی پیش کار، تحریک انصاف کی مشہور سیاسی کارکن، اسکالرِ مغرب اور پاکستان میں انسانی حقوق کی وزیر شیریں مزاری کا کہنا ہے کہ ہم یہ قانون اقوامِ متحدہ کے قوانین کی پاسداری میں بنا رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ ایک طرف وزیر اعظم صاحب باتوں کے تیر چلا چلا کر بلکہ چِلا چِلا کر ’’بھاگتے چور‘‘

امریکا کی لنگوٹی تار تار کر رہے ہیں اور مغربیوں کے سامنے مغرب کے سماجی نظام کے عیوب بیان کر رہے ہیں۔ موصوف ابھی تک اپنے تئیں، ریاستِ مدینے کے دعوے و وعدے پر قائم ہیں۔ لیکن ان کی ناک تلے جوڈا کا پڑ گیا اس پر جیسے ان کی زبان گنگ سی ہو گئی ہے۔ جالب ہوتا تو وہ کہہ دیتا: ''جن کو تھا زباں پہ ناز، چپ ہیں وہ زباں دراز''، چلیں وہ تو نہ ہوا، یہ شہباز جس کی پرواز سے زمانہ جلتا ہے وہ کیوں خاموش ہے:

بولتے کیوں نہیں میرے حق میں　　　آبلے پڑ گئے زباں میں کیا

شاہ اور شاہباز سے ہم اتنا کچھ ہی کہہ سکتے ہیں، اپنے عوام کے لیے بھی یہی پیغام ہے:

بول، زبان اب تک تیری ہے　　　بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

تو اپنے حلقۂ احباب اور سماجی رابطہ گاہوں پر اور جہاں بھی ہو سکے اس خلافِ شرع قانون کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ اس قانون میں عورتوں کی آزادی و اختیار کی بہت بات کی گئی ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف نہ کرنا، ان پر ایسے اختیار کی ممانعت کہ جس سے ان کی ذاتی خلوت (privacy) متاثر ہو جائے۔ لیکن آپ رسول اللہ ﷺ کو دیکھیں کیا فرماتے ہیں، اور یہ حجۃ الوداع کے موقعے پر، عین ایامِ تشریق میں دیے گئے ایک خطبے کا حصہ ہے اور اس میں بھی پہلے شیطانی حملے کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس کے آگے بند باندھنے کی جو ترکیب بتائی وہ بھی عورت سے متعلق ہے: ((أَلَا إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ، وَلَكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَكُمْ، فَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٌ، لَا يَمْلِكْنَ لِأَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا، وَإِنَّ لَهُنَّ عَلَيْكُمْ، وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ حَقًّا: أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا غَيْرَكُمْ، وَلَا يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِأَحَدٍ تَكْرَهُونَهُ، فَإِنْ خِفْتُمْ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ، وَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ)) (مسند احمد) ''آگاہ رہو، بے شک شیطان اس سے تو مایوس ہو ہی گیا ہے کہ نمازی (یعنی اہلِ ایمان) اس کی عبادت کریں گے لیکن وہ تمھارے درمیان فساد ضرور پیدا کرنا چاہے گا۔ پس عورتوں کے معاملات میں اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ تمھاری دَستِ نگر ہیں، وہ اپنے حق میں کچھ اختیار نہیں رکھتیں، بے شک تم پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ان پر تمھارے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ وہ تمھارے بستروں پر کسی اور کو نہ آنے دیں اور نہ ہی تمھارے

گھروں میں کسی ایسے فرد کو آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر تمھیں ان کی سرکشی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کے بستر الگ کردو اور اگر پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کو ایسا ہلکا سا مارو کہ ان کے جسم پر نشان نہ پڑے" اس حدیث کی دیگر روایات میں عورتوں کے مزید حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ لیکن یہاں موضوع کی مناسبت سے وہ حصہ دیا گیا جو ان کی تادیب کے بارے میں ہے، تو اس میزان میں پرکھ لیجیے نام نہاد قانون سازی کو، کہ وہ کتنی اسلام کے مطابق ہے۔ اس سلسلے کی ایک روایت میں الفاظ آتے ہیں:((فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانَةِ الله))"بے شک تم نے ان کو لیا ہے اللہ کی امانت کے طور پر" ایک روایت میں آتا ہے:((وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ الله))"تم نے ان کی شرمگاہوں کو اپنے لیے حلال کیا اللہ کے کلمے کے ذریعے" اس کی وضاحت میں کہا گیا:((أَيْ بِشَرْعِهِ أَوْ بِأَمْرِهِ وَحُكْمه))" یعنی اللہ کی شریعت یا اس کے حکم و امر کے ذریعے تم نے ان کے ساتھ اپنا تعلق بنایا ہے" تو اب خواتین کے حق میں اللہ سے ڈرنے کا تقاضا اس کے سوا کیا ہے کہ ان سے جو معاملہ بھی کیا جائے وہ اللہ کی شریعت اور اس کے قوانین کے مطابق ہی کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان سے تعلق تو اللہ کی شریعت کے مطابق بنایا جائے اور اس تعلق کو نبھانے کے قواعد و ضوابط اقوام متحدہ کے ایجنڈے کی روشنی میں طے کیے جائیں:

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مندرجہ بالا حدیث مبارکہ کی بنیاد اس قرآنی اصول پر ہے:﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾" مرد عورتوں پر حاکم ہیں" (النساء:۳۴، ترجمہ شاہ عبد القادر)ابن کثیر ان الفاظ کی تشریح میں لکھتے ہیں:أَيْ هُوَ رَئِيسُهَا وَكَبِيرُهَا وَالْحَاكِمُ عَلَيْهَا وَمُؤَدِّبُهَا إِذَا اعوجَّت(ابن کثیر)"یعنی مرد اس کا سردار اور بڑا ہے، اور وہ اس پر حاکم اور اس کی تادیب واصلاح کرنے والا ہے اگر وہ ٹیڑھ اختیار کرے تو" امام طبری نے لکھا ہے:الرجال أهل قيام على نسائهم، في تأديبهن والأخذ على أيديهن فيما يجب عليهن لله ولأنفسهم "مرد عورت پر نگران ہیں ان کی تادیب و تربیت میں، اور جو کچھ ان عورتوں پر حقوق اللہ اور حقوق زوج کے ضمن میں عائد ہوتا ہے اس کی ادائی کرانے پر وہ اختیار رکھتے ہیں"۔ بہت

ساری احادیث اس موضوع کی بابت وارد ہوئی ہیں۔ان میں سے ایک اہم روایت یوں ہے:((اَلرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مسؤولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))(بخاری)''مرد نگران ہے اپنے گھر والوں پر اور وہ مسئول ہے اپنی اس رعیت کی بابت''، اس حدیث میں یہ تو ہے کہ مرد اپنی رعیت کے بارے میں اللہ کو جوابدہ ہے لیکن اس حدیث سے یہ بھی تو پتا چلتا ہے کہ گھر والوں میں اس کی حیثیت حاکم کی سی ہے۔اسی حدیث میں عورت کے بارے میں آتا ہے:((الْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهِ وَهْيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ))(بخاری)''عورت نگران ہے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر اور وہ اس کے بارے میں جوابدہ ہے''۔اس میں عورت کی نگرانی یا چلیں حاکمیت کا ذکر ہے لیکن دیکھیں کہ گھر اور اولاد کی نسبت خاوند کی طرف کی گئی ہے یعنی گھر کی حاکمیت تو خاوند ہی کی ہے البتہ بیوی کو خاوند کے ایک نائب کی حیثیت حاصل ہے اور اسی حیثیت سے وہ گھر اور اولاد کے بارے میں جوابدہ ہے اور یہ مفہوم پچھلی حدیث اَلرَّجُلُ رَاعٍ سے بھی نکلتا ہے۔ اب ایک نیک مسلمان عورت کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود کو خاوند کی جوابدہ سمجھے اور اولاد اور گھر کے معاملات کو''گھر والے'' کی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مرد کے آگے سرکشی کرے اور اس کے لیے ایک چیلنج کا سا انداز اختیار کرے:﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ﴾''پس نیک عورتیں وہ ہیں جو تابعداری کرنے والی ہیں، جو اللہ کی حفاظت کے ساتھ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنے والی ہیں''۔ایک حدیث میں فرمایا:((خَيرُ النساءِ امرأةٌ إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَإِذَا أَمَرْتَها أطاعتكَ وَإِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِي نَفْسِها ومالِكَ))(مسند البزار)''بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کی طرف دیکھے تو وہ تجھے خوش کردے اور جب تو اسے حکم دے وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو کہیں باہر جائے تو وہ اپنی عفت و عصمت اور تیرے مال کی حفاظت کرے''۔

اور رہی یہ بات کہ عورت خاوند کی اطاعت نہ کرے بلکہ سرکشی کرے تو اس کی ہدایات بھی اللہ تعالیٰ نے دی ہیں: ﴿وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾(النساء:۳۴)''اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو(پہلے) انھیں

سمجھاؤ، اور (اگر اس سے کام نہ چلے تو) انھیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو، (اور اس سے بھی اصلاح نہ ہو تو) انھیں مار سکتے ہو۔ پھر اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو ان کے خلاف کارروائی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کے اوپر، سب سے بڑا ہے''۔ اب اگر تادیب و سزا سے بھی بیوی کی اصلاح نہ ہو رہی ہو تو اصلاح کا اگلا مرحلہ یہ نہیں ہے کہ تھانہ کچہری کا راستہ دیکھا جائے بلکہ خاندانوں کے معزز افراد کو منصف بنایا یائے اور وہ ان دونوں کی اصلاح کی کوشش کریں: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾ (النساء:۳۵) ''اور اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو (ان کے درمیان فیصلہ کرانے کے لیے) ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے بھیج دو۔ اگر وہ دونوں اصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان اتفاق پیدا فرما دے گا۔ بیشک اللہ کو ہر بات کا علم اور ہر بات کی خبر ہے''۔ اس کے بعد طلاق کا مرحلہ بھی آسکتا ہے جس کے آداب و شرائط مقرر ہیں لیکن ہم طوالت کے خوف سے ادھر نہیں جاتے۔ شریعت میں اولاد کی تربیت کرنا والد کی ایک خاص ذمے داری ہے۔ حدیث عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں آتا ہے: ((أَدِّبِ ابْنَكَ، فَإِنَّكَ مَسْئُولٌ عَنْ وَلَدِكَ، مَاذَا أَدَّبْتَهُ؟ وَمَاذَا عَلَّمْتَهُ، وَإِنَّهُ مَسْئُولٌ عَنْ بِرِّكَ وَطَوَاعِيَتِهِ لَكَ (شعب الایمان) ''اپنے بیٹے کی تربیت کرو کیونکہ تم سے اپنے بیٹے کی بابت پوچھا جائے گا کہ تو نے اسے کیا سکھایا پڑھایا اور بے شک بیٹے سے تیرے (یعنی باپ) کے ساتھ حسن سلوک اور اطاعت کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ متنازعہ قانون میں اولاد کی آزادی کی بھی بات کی گئی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ تربیت کے میدان میں رعب و دبدبے بلکہ ہلکی پھلکی سزا کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عربی میں تادیب، تربیت کے لیے بھی آتا ہے اور یہی لفظ تادیب، تادیبی کاروائی یعنی سزا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تربیت میں تادیب کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ تادیب کہتے ہیں اس سزا کو جو تربیت و اصلاح کے نقطۂ نظر سے دی جائے''۔

گھریلو تشدد کے خاتمے کے بل کی شقوں اور اس کی توضیحات کا مطالعہ کرنے سے بادنیٰ تامل یہ بات سمجھ آتی ہے کہ والدین کے اس خصوصی اختیار کو جو بطور، تربیت کنندہ کے انھیں دیا گیا ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حوالے

سے جب ہم رسول اللہ ﷺ کے فرامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کچھ دوسری صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے: فرمایا: ((أَنْفِقْ عَلَى عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ، وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ أَدَبًا وَأَخِفْهُمْ فِي الله))(مسند احمد) ''اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کیا کرو اور ان پر سے اپنے تادیبی ڈنڈے کو اٹھائے مت رکھو اور انھیں اللہ کے بارے میں ڈرائے رکھو''۔ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:((عَلِّقُوا السَّوْطَ حَيْثُ يَرَاهُ أَهْلُ الْبَيْتِ فَإِنَّهُ أَدَبٌ لَهُمْ))(صحیح الجامع) ''اپنا کوڑا ایسی جگہ لٹکائے رکھو جہاں سے گھر والوں کو دکھتا رہے، یہ بات تربیتی نقطۂ نظر سے ان کے لیے بہتر ہے''۔

خلاصہ کلام یہ کہ گھریلو تشدد کے خاتمے کے نام سے کی جانے والی قانون سازی خلاف شریعت اور ابلیسی منصوبہ ہے۔ ان حالات میں فرامین الٰہی کی طرف اپنی توجہ شدت سے مرکوز رکھنی چاہیے: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ * إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾(البقرہ:۱۶۷/۱۶۸) ''اے لوگو!شیطان کے نقشِ قدم پہ نہ چلو بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے بے شک وہ تمھیں حکم کرتا ہے برائی اور فحاشی کا''۔ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (النور:۲۱)''اے اہلِ ایمان!شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو اور جو شیطان کے نقش قدم پہ چلے گا پھر وہ تو اسے فحاشی اور گناہ ہی کا حکم دے گا''۔اگر ہم اسی روش پر گامزن رہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ تہدید آمیز شکوہ سامنے رہنا چاہیے:﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا﴾(الکھف:۵۰) ''کیا تم مجھے (اور میری شریعت کو) چھوڑ کر شیطان کی اور اس کی اولاد کو اپنا دوست بناتے ہو جب کہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔(اللہ تعالیٰ کا)کتنا برا متبادل ہے جو ظالموں کو ملا ہے''۔

****

مولانا محمد اقبال
معاونِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

ذکرِ الٰہی کی اقسام

سورۃ الرعد آیت ۲۸

﴿أَلَّذِينَ أٰمَنُوا،وَ تَطمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكرِ اللّٰهِ،أَلَا بِذِكرِ اللّٰهِ تَطمَئِنُّ القُلُوبُ﴾

”یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے“۔

آیتِ مبارکہ کی تفسیر

یادِ الٰہی یعنی اللہ کی تسبیح، تقدیس اور حمد ایک مستقل عبادت ہے، قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ میں اس کے بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ مؤمنین کی صفات میں سے ایک یہ صفت بیان کرتی ہے کہ وہ یادِ الٰہی سے اطمینان حاصل کرتے اور آرام پاتے ہیں۔ چونکہ یادِ الٰہی روح کی غذا ہے، اس لیے بندۂ مومن بے سکونی اور بے اطمینانی کا علاج یادِ الٰہی سے کرتا ہے۔ اس کے لیے ذکر اللہ سکون قلب کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ یاد الٰہی دل کی نورانیت، سکون قلب اور ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کے ذریعے گناہوں کی بخشش ہوتی ہے۔ انسان اس کی بدولت آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جبکہ غفلت میں پڑے رہنے کی مذمت کی گئی ہے، سورۃ الحشر آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ''اور تم ان جیسے نہ ہوجانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے انھیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں''۔ تو جو لوگ اللہ کی یاد سے غافل اور بے پرواہ ہوگئے ہیں تو یہ درحقیقت اپنی ذات سے بے پرواہ ہوگئے ہیں۔ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ خود ان کی جانوں کے لیے کونسی بات فائدے کی ہے اور کونسی نقصان کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یاد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود ان کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر وہ غافل ہوتے ہیں تو اپنا نقصان کرتے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں آتا ہے: ((مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ رَبَّهُ، مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ)) ''اس شخص کی مثال جو اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور اس کی مثال جو اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہوتا ہے زندہ اور مردہ جیسی ہے''۔ ایک شخص نے بارگاہ رسالت ﷺ میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! ((إِنَّ شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ، فَأَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهِ)) ''اسلام کے احکام وقوانین تو میرے لیے بہت ہیں، کچھ تھوڑی سی چیزیں مجھے ارشاد فرمائیں تاکہ جن پر میں مضبوطی سے جما رہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا ((لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ)) ''تمھاری زبان ہر وقت اللہ کی یاد اور ذکر سے تر رہے''۔ (ترمذی)

ذکر اللہ کی مختلف اقسام

ذکرِ الٰہی کو مختلف اعتبارات سے تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ذکر لسانی ہے یعنی بندہ زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذِکر کرے، اس میں تسبیح، تقدیس، ثنا، حمد، استغفار اور دعا وغیرہ داخل ہیں۔ ایک ذکر قلبی ہے یعنی قلب سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، کہ بندہ دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اس میں اللہ کی عظمت وکبریائی اور اس کے مظاہر قدرت میں غور کرنا، تدبر اور فکر کرنا، یہ سب ذکر قلبی میں داخل ہے۔ ذکر کی ایک تقسیم، ذکرِ سری وذکر جہری ہے جس کا تعلق آواز کی کمی وبیشی سے ہے۔ اسی طرح ذکر کی ایک تقسیم ذکر خفی وذکر جلی بیان کی جاتی ہے جس کا تعلق خلوت وتنہائی اور جلوت واجتماع سے ہے۔ چوں کہ ذکر سے مقصود روحانی زندگی اور بالیدگی ہے جس کا حاصل اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اس لیے اس حاصل پر نظر کرتے ہوئے، بعض علمانے

اطاعت وعبادت الٰہی کو بھی ذکر میں داخل کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو''۔(طٰہٰ:۱۴)آیتِ مبارکہ﴿اَلَّذِينَ أٰمَنُوا،وَتَطمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكرِ اللّٰهِ،أَلَا بِذِكرِ اللّٰهِ تَطمَئِنُّ القُلُوبُ﴾میں ''یادالٰہی'' کا ذکر مطلق آیا ہے اور کسی قسم کی تخصیص نہیں کی گئی اس لیے اس میں ذکر کی تمام اقسام مثلاً ذکر لسانی وقلبی، ذکر خفی وجلی اور ذکر سری وجہری وغیرہ داخل ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ذکر کی اہمیت کو پیش نظر رکھیں اور اپنے ظروف واحوال اور ذوق کے مطابق ذکر کے کسی بھی انداز کو اختیار کیے رکھیں تاکہ ہمارے ایمانی جذبات کو جلا حاصل ہو اور ہم عبادت الٰہی میں پختہ تر ہوتے جائیں۔

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

قلبِ حزیں

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ اللهَ يُحِبُّ كُلَّ قَلْبٍ حَزِينٍ))(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد و قال الهيثمي رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَالطَّبَرَانِيُّ، وَإِسْنَادُهُمَا حَسَنٌ) ''سیدنا ابوالدراء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر دل غمگین کو پسند کرتا ہے''۔

تشریح

حزن یعنی غم سے وہ غم مراد نہیں ہے جو دنیا کے نہ ملنے یا کم ملنے پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا پر غم کرنے سے روکا گیا ہے۔ اگرچہ انسان کبھی کسی کمزور لمحے میں اس کا شکار ہو جائے تو اس کی گنجائش تو ہے لیکن یہ قابل تعریف نہیں ہے۔ وہ حزن و ملال جو حدیث میں بر مقام مدح بیان کیا گیا وہ دوسری نوعیت کا ہے۔ قلب حزیں کی اصطلاح قلب القاسی، یعنی گناہوں کے سبب سخت ہو جانے والے دل کے مقابلے میں آئی ہے۔ لہذا قلب حزیں سے مراد وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے معمور ہو اور اس خشیت کے زیر اثر وہ اپنے گناہوں اور تقصیرات پر نادم رہتا ہو، آخرت کے احوال سے لرزاں و ترساں ہو کر آخرت کی تیاری میں مگن رہتا ہو۔ قلب حزیں سے مراد وہ دل بھی ہے جو نرم ہو اور مخلوق پر رحمت و شفقت کا مظاہرہ کرنے والا ہو۔ وہ دل جو اخلاقِ کریمہ یعنی خوف، رقت، محبت، اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے غضب سے ڈرتا

ہو۔ایک نیک اور اخلاقِ کریمہ سے معمور دل کے لیے قلبِ حزیں کی اصطلاح استعمال کرنے میں کیا حکمت ہے؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حزن و ملال، دل میں رقت پیدا کر کے، دل کی زمین کو نرم کر کے اسے اعلی اخلاق کی تخم ریزی کے لیے تیار کرتا ہے۔ تو چونکہ حزن؛ دل کی اصلاح کے لیے سبب بنتا ہے تو اس کے سبب بننے کی صلاحیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اعلیٰ صفات کے حامل دل کے لیے قلبِ حزیں کی اصطلاح استعمال کی گئی۔

حزن و ملال کے بارے میں چند اصولی باتیں

پہلی بات وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ غموں کا آنا انسان کے لیے فائدہ مند ہے۔ شمائل میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ متواصل الاحزان تھے یعنی آپ پر دکھ پے در پے آیا کرتے تھے۔ احادیث کے مطابق دنیاوی دکھ بعض اوقات بعض گناہوں کے کفارے کے طور پر پہنچائے جاتے ہیں اور بعض دفعہ درجات کی بلندی کے لیے۔ بعض اوقات مصیبتوں میں مبتلا کر کے انسان کو توبہ کی توفیق دی جاتی ہے۔ اب اگر کسی انسان پر مصیبت آجائے تو اگرچہ اسے تکلیف محسوس ہوگی اور وہ اسے ناپسند کرے گا لیکن انجام کار کے اعتبار سے مصیبت کا آنا اس کے لیے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:((يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيضِ)) (سنن ترمذی) ”قیامت والے دن جب دنیا میں مصیبتیں برداشت کرنے والوں کو ثواب دیا جائے گا تو دنیا میں عافیت سے رہنے والے لوگ خواہش کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹ دی گئی ہوتیں“۔ یہ تو خیر اہلِ عافیت کی وہ خواہش ہے جو وہ آخرت میں ظاہر کریں گے لیکن اس دنیا میں رہتے ہوئے کسی کے لیے آزمائش کی خواہش کرنا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ مصیبت پر ڈھیروں اجر ملنے والا ہے لیکن وہ مشروط ہے صبر کے ساتھ۔ اگر انسان مصیبت میں صبر نہ کرے بلکہ جزع فزع اور شکوے شکایت شروع کر دے تو ان مصیبتوں سے اسے فائدہ تو کیا الٹا نقصان ہوگا۔ اب چوں کہ یہ معلوم نہیں ہے آنے والی مصیبت پر میں صبر کر سکوں گا یا نہیں تو اس لیے مصیبت کے آنے کی دعا یا تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ ایک صحابی یہ دعا مانگ رہے تھے:(اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّبْرَ)” اے اللہ میں تجھ سے صبر کی توفیق مانگتا ہوں“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((سَأَلْتَ اللهَ الْبَلَاءَ فَاسْأَلْهُ الْعَافِيَةَ))(سن ترمذی)”تم نے تو آزمائش مانگ لی، اللہ

سے عافیت کا سوال کرو"۔ایک حدیث میں فرمایا:((يَا أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيتُمْ فَاصْبِرُوا))(متفق عليه)"اے لوگو! دشمن سے مڈ بھیڑ کی تمنا نہ کرو، بلکہ اللہ سے عافیت طلب کرو، لیکن اگر آمنا سامنا ہوجائے تو پھر صبر کا مظاہرہ کرو"۔ بہر حال ہم نے یہ سمجھا کہ دکھ درد انسان، کی مغفرت اور درجات کی بلندی، کا باعث بنتے ہیں۔اور مصیبتوں سے انسان کا دل نرم ہوجاتا ہے اور پھر توبہ واصلاح کا امکان بڑھ جاتا ہے۔اسی لیے بعض بزرگوں کا قول ہے عمارة القلب بالأحزان "دل کی آبادی دکھوں کے ساتھ ہے"۔

*****

حافظ معاذ بن تجمل
طالب علم دورۂ حدیث شریف، فقہ اکیڈمی

اسکت! لا شیخ لک

خاموش ہو جاؤ، تمھارا کوئی استاد نہیں!!

علم دین کی روایت میں استاد یا شیخ کی حیثیت جڑ اور بنیاد کی سی ہے۔ احادیث مبارکہ میں پہلے شاگردی کا ذکر آتا ہے اور اس کے بعد معلمی کا، مثال کے طور پر ایک حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَ عَلِّمُوهُ النَّاسَ)) "پہلے علم حاصل کرو اور پھر دوسرے لوگوں کو پڑھاؤ"۔ (سنن دارمی) ان الفاظ کی غایت بتاتے ہوئے محدثین لکھتے ہیں: لِتکُونُوا کَامِلِینَ مُکَمِّلِین " تاکہ تم خود کامل اور دوسروں کو مکمل کرنے والے بن جاؤ"۔

حدیث اور اس کی شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان شاگردی کرنے ہی سے کامل بنتا ہے اور کامل بننے کے بعد ہی وہ دوسروں میں کمال پیدا کر کے انھیں کامل بنانے کا اہل بنتا ہے۔ متفق علیہ حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا لیکن اس علم کے اٹھائے جانے کی صورت کیا ہوگی اس کی وضاحت ان الفاظ سے ہوتی ہے ((یَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ)) " اللہ علم کو اٹھائے گا، علما کو اٹھانے کے ذریعے سے " اسی حدیث میں آگے آتا ہے جب علما نہیں رہیں گے تو لوگ جاہل لوگوں کو امام و شیخ بنالیں گے، پھر وہ جاہل لوگ اپنی لاعلمی کے باوجود لوگوں کی راہنمائی کرنے کی کوشش کریں

گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اس حدیث میں آپ دیکھیں کہ علم کا مدار علما کو بنایا گیا ہے اور یہ کہ جاہل آدمی کی پیشوائی کتنی خطرناک بات ہے۔ علماے محققین ہمیشہ علمی ناپختگی کے اس رجحان کی نفی فرماتے رہے ہیں۔ کسی بزرگ کا قول ہے: من كان شيخه كتابه فخطأه أكثر من صوابه ”جس شخص نے کتابوں کو اپنا شیخ واستاد بنالیا تو اس کی خطائیں اس کی درستیوں سے بڑھ جاتی ہیں“۔

عصر حاضر کے ایک محقق عالم و محدث شیخ علامہ محمد عوامہ دامت برکاتہم ہیں۔ آپ ملک شام کے شہر حلب میں ۱۹۴۰ میں پیدا ہوئے اور علوم دینیہ کے حصول کے لیے شہر مدینہ اور ملک مصر کا سفر کیا۔ آپ کو دو جلیل القدر علماے دین، شیخ عبداللہ سراج الدین اور شیخ عبدالفتاح ابو غدۃ رحمہما اللہ سے طویل شرف تلمذ حاصل ہے۔ حال ہی میں شیخ عوامہ حفظہ اللہ نے اردن کے ایک ٹی وی چینل کے پروگرام ’فاسئلو أهل الذكر‘ میں اس اہم مسئلے پر بات کی ہے۔ معمولی کمی بیشی کے ساتھ ہم اس گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

”میدان علم میں ایک طالب علم کے لیے اساتذہ و مشائخ؛ اس کے آبا و اجداد کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس طرح انسان نسب کے لیے اپنے گھر، خاندان یا قبیلے کا محتاج ہوتا ہے کہ اسی سے اس کے نسبی آبا و اجداد معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح علمی و روحانی نسب میں وہ اپنے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام کا محتاج ہوتا ہے تاکہ علمی شجرے سے اس کی نسبت درست ہو سکے۔ جس شخص کا نسبی باپ معلوم نہ ہو تو وہ مجہول النسب کہلاتا ہے اور اگر اس نے ادھر ادھر کسی دوسرے کے ہاں پرورش پائی ہو تو وہ لے پالک کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کا کوئی استاد نہ ہو تو وہ علم کی دنیا میں یا تو مجہول النسب کہلائے گا یا لے پالک!!“ جو ناخوب تھا وہی خوب ہوا“ کے مظاہر دور جدید میں بے شمار پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس کا کوئی استاد نہ ہو اور وہ اپنے ذاتی مطالعے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر، عالم یا استاد بن بیٹھتا ہے تو اس کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک بری اور قابل مذمت بات تھی، لیکن آج کل یہ ایک خوبی اور قابل تعریف بات سمجھی جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ شخص متکبر ہے کہ یہ اپنی عقل کا شاگرد بن کر اپنے ہی ذہن کے تراشیدہ راستے پہ چلے جا رہا ہے۔ خلیفہ معتصم العباس کے سامنے جب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو لایا گیا تو وہاں اس وقت کا سرغنہ فتنہ احمد ابن ابی داؤد بھی موجود تھا۔ خلیفہ نے امام

احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو حکم دیا کہ احمد ابن ابی داؤد سے بات کریں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایک عظیم الشان جملہ کہہ کر اس حکم کو ٹال دیا کہ میں کیسے اس شخص سے بات کروں کہ جس کو میں نے آج تک کسی عالم کے دروازے پر نہیں دیکھا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کتاب ”ترتیب المدارک“ میں ابو جعفر الداؤدی کے حالات لکھے ہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ایک طرف تو ان کے علوم وفنون کی تعریف کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی مذمت میں ایک جملہ لکھا کہ ابو جعفر الداؤدی نے اپنے بڑوں سے ترتیب کے مطابق علم حاصل نہیں کیا جس طرح علم حاصل کرنے کا حق تھا، یعنی کسی فقیہ سے اخذِ علم نہیں کیا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب ابو جعفر الداؤدی نے علماے قیروان کو عبیدین کے خلاف خروج کی دعوت دی تو علماے قیروان نے صرف ایک جملہ کہہ کر بات سمیٹ دی کہ ”خاموش ہو جاؤ! تمھارا کوئی استاد نہیں“۔ پس جس شخص کا کوئی استاد نہیں جس نے اسے درجہ بدرجہ علم سکھایا ہو اور اس کی تربیت کی ہو تو ایسے شخص کی طرف بالکل التفات نہیں کرنا چاہیے چاہے اس نے بہت کچھ پڑھا یا لکھا ہو۔ اس لیے کہ جس کا استاد نہیں اس کے علم کی نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی کوئی اہمیت!!

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم وناظمِ شعبہ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۲)

وارثانِ بیت المقدس اور اسلام

حضرت عیسی علیہ السلام کے رفع سماوی سے فترۃ وحی کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ جب دنیا میں کہیں کسی نبی و رسول کا بابرکت وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ بیت المقدس کی دونوں متولی قومیں خستہ حالی کا شکار تھیں۔ عیسائی، یہودیوں اور مشرکوں، ہر دو کے ظلم کا شکار تھے۔ ستر عیسوی کے لگ بھگ قوم یہود، مخالفتِ انبیا، بالخصوص حضرت عیسی علیہ السلام کو قتل کرنے کے اقدام کی سزا میں اللہ تعالی کے غیظ و غضب کی حقدار ٹھہر کر بیت المقدس سے بے دخل کی جا چکی تھی۔ بیت المقدس پر سلطنت روم کی براہ راست حکومت قائم تھی۔ ابتدائی عرصے میں تو اہل روم اپنے پرانے مشرکانہ مذہب پر قائم رہے لیکن چوتھی صدی عیسوی میں قیصرِ روم کے عیسائیت قبول کرنے سے پوری قوم نے عیسائیت کو اختیار کر لیا اگرچہ یہ تحریف شدہ عیسائیت تھی جسے پال ازم کہنا مناسب ہے۔ اسی خطے میں فارس کی بت پرست سلطنت بھی قائم تھی۔ ان دونوں طاقتوں کی باہمی آویزش وقفوں وقفوں سے جاری رہتی تھی۔ اب نبی کریم ﷺ کا دور شروع ہوتا ہے۔ آپ اولادِ ابراہیمی کی مکی شاخ سے تھے۔ آپ کی پیدائش عام الفیل، ماہ ربیع الاول میں ہوئی۔ عیسوی تقویم کے مطابق یہ ۵۷۱ بعدِ مسیح کا سال اور اپریل کا مہینا تھا۔ آپ کی پیدائش کے موقعے پر ایک روشنی ظاہر ہوئی جس سے روم کے محلات روشن ہو گئے۔ اسی موقعے پر شاہ

فارس کے محل کے چودہ کنگرے کر گئے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ ان دونوں حکومتوں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔

نبی کریم ﷺ کے ساتھ بنی اسرائیل کا معاملہ کیا رہا ہم اسے دو صورتوں میں پیش کریں گے۔ واقعاتی اندازِ بیان کی طرف ہم بعد میں آئیں گے پہلے اجمالی اور اصولی انداز میں اس اہم مسئلے پر بات کرتے ہیں، ہمارے اس کلام سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ بیت المقدس پر حق تولیت کس کا ہے۔ اشوریوں، بابلیوں اور رومیوں کی ترکتازیوں کے مواقع پر اکا دکا بنی اسرائیلی قبائل، جزیرۃ العرب میں وارد ہوتے رہے۔ یہ مقامی لوگوں میں بھی اپنے دین کے نفوذ کا ذریعہ بنتے۔ ان میں سے کچھ افراد کا آنا جانا اور ربط و ضبط مکے کے لوگوں سے بھی تھا یہاں تک کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی جیسے ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ لیکن اہل کتاب کی کوئی باقاعدہ بستی مکہ میں آباد نہ تھی۔ اس لیے مکے میں آپ ﷺ کا ان سے براہ راست مخاطبہ نہیں ہوا۔ البتہ مدینہ میں یہود کے تین قبائل آباد تھے چنانچہ جب نبی کریم ﷺ یہاں تشریف لائے تو آپ کا اس قوم سے سابقہ پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت بنی اسرائیل کے لیے ایک نعمت مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک نادر موقع تھا کہ آپ ﷺ کے دامن رحمت میں پناہ لے کر اپنے دامنِ دریدہ کے بدنما داغ دھو لیتے۔ چنانچہ مکی قرآن ہی میں ان سے خطاب کرکے فرما دیا گیا تھا: ﴿عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا﴾ (بنی اسرائیل:۸) ”قریب ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم نے وہی کچھ کیا تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے“۔ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اب بنی اسرائیل سے آپ ﷺ کا اور قرآن کریم کا مخاطبہ شروع ہوا۔ چنانچہ اہل کتاب کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾ (البقرہ:۴۱) ”اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی جو تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو تمھارے پاس ہے اور تم پہلے پہل اس کا کفر کرنے والے نہ بنو اور نہ ہی میری آیات کا تھوڑا مول لو اور مجھ ہی سے ڈرو“ بنی اسرائیل کے آخری نبی سیدنا عیسی علیہ السلام یہ خبر دے گئے تھے کہ آخری رسول ”احمد“ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ انجیل میں آپ ﷺ کی کئی ایک نشانیاں مذکور تھیں۔ لیکن یہ لوگ قرآن اور صاحب قرآن کو

پہچاننے کے باوجود ایمان نہ لائے: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (الانعام:۲۰) ''وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے اس (آخری رسول) کو یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان لوگوں نے خود کو نقصان میں ڈالا پس یہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

بنی اسرائیل نے نہ صرف رسولوں پر ایمان اور ان کی نصرت کے وعدے کو توڑا بلکہ آسمانی کتابوں میں تحریف کر کے نبی آخر الزمان ﷺ کی خبریں و علامتیں چھپانے کی کوشش بھی کی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ''لعنتِ مزید'' کے مستحق ہو گئے: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (المائدۃ:۱۳) ''پس بسبب اپنے میثاق کو توڑنے کے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو اور سخت کر دیا اور وہ کلام کو اس کی جگہوں سے آگے پیچھے کرنے لگے اور جو نصیحتیں انھیں کی گئی تھیں ان کے بڑے حصے کو بھی وہ بھلا بیٹھے'' اسلام کی حقانیت اور اہل کتاب کے اعراض کو ایک جگہ یوں بیان کیا گیا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللهِ فَإِنَّ اللهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ (آل عمران:۱۹) ''بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے اور جنھیں کتاب دی گئی تھی انھوں نے، اس میں اختلاف کیا مگر دلیل آجانے کے بعد اور وہ بھی اپنی ضد کی وجہ سے، پس جو کوئی اللہ کی آیات کا کفر کرے گا پس اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے''۔ در اصل اہل کتاب کو مسلمانوں سے حسد تھا کہ آخری نبی اور آخری کتاب، بنو اسحاق کے بجائے بنو اسماعیل کو کیوں دے دی گئی: ﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (البقرۃ:۱۰۹) ''بہت سارے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا دیں۔ اس حسد کے سبب جو انھیں لاحق ہے بعد اس کے کہ ان پر حق واضح ہو بھی چکا'' ان کے کفر اور اس کی وجہ، ضد و حسد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَافِرِينَ۞بِئْسَمَا

اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾(البقرہ:۸۹،۹۰) ”اور جب آگئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب جو سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے کافروں پر فتح طلب کیا کرتے تھے لیکن جب وہ آگئی ان کے پاس جس کو انھوں نے پہچان بھی لیا تو اس کا کفر کر دیا پس ان کافروں پر لعنت ہے بہت برا ہے وہ سودا جس میں انھوں نے اپنے آپ کو بیچا کہ انھوں نے کفر کیا اس کا جو نازل کیا تھا اللہ نے، اس ضد کی وجہ سے کہ اللہ اپنے فضل سے (کتاب) نازل کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے پس وہ غضب پر غضب لے کے لوٹے اور کافروں کے لیے تو ذلت آمیز عذاب ہے“ اہل کتاب بالخصوص یہود کی ڈھٹائی کا عالم یہ تھا کہ وہ حق سے منھ موڑنے کو اپنی ایک خوبی کے طور پر بیان کرتے تھے:﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ”پس بسبب ان کے میثاق کو توڑنے کے اور اللہ کی آیتوں کا کفر کرنے سے ناحق طور پر انبیا کو قتل کرنے کے اور ان کے یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دل تو غلافوں میں ہیں بلکہ اصل میں تو اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر پس وہ ایمان نہیں لائیں مگر بہت تھوڑا“۔﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ﴾(البقرہ:۸۸)”اور انھوں نے کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں، بلکہ اللہ نے لعنت کی ان کے دلوں پر، پس تھوڑا ہی یہ ایمان لاتے ہیں“۔

اگر بنی اسرائیل رسول آخری ﷺ پر ایمان لے آتے تو بیت المقدس کا تنازع کھڑا ہی نہ ہوتا بلکہ جس طرح کلید بردار کعبہ، عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد کعبے کی کلید برداری قیامت تک ان کے خاندان میں جاری فرما دی اسی طرح اگر بنی اسرائیل اسلام قبول کر لیتے تو شاید وہ بیت المقدس کی تولیت سے محروم نہ کیے جاتے۔ بنی اسرائیل کے گروہ یہود کی شرارتوں کا تو ذکر آگے آئے گا لیکن ان میں سے زیادہ عدل و انصاف کے قریب سمجھے گئے گروہ نصاریٰ کا حال دیکھیے کہ ان کے بادشاہ، قیصرِ ہرقل تک جب رسول اللہ ﷺ کا خط پہنچا تو اس نادان نے آپ ﷺ کے پاؤں دھونے کی

'حسرت' کا اظہار تو کیا: وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمِهِ (صحیح بخاری) "اگر میں ان کے پاس جا سکتا تو ان کے پاؤں دھو کر پی لیتا"، حالانکہ پاؤں دھو کر پینے کا اس سے تقاضا کیا ہی نہیں گیا تھا اور جس کام کا اس سے تقاضا تھا، جس کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہ تھی، یعنی قبولِ اسلام اس سے پہلو بچا گیا۔ چنانچہ جس طرح کسی دور میں رومی بادشاہ کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ سے عام رومیوں نے عیسایت قبول کرلی تھی اس طرح کی قبولیت، عیسائت میں اسلام کو نہ مل سکی۔ قیصر اسلام نہ قبول کرسکا اور عوام کا گناہ بھی اس کے سر رہا۔

بیت المقدس کی تولیت کس کا حق ہے

بنی اسرائیل کے کفر کے بیان کے بعد ہم اس بیت المقدس کے حق تولیت پر کچھ عرض کرتے ہیں۔ پیچھے ہم نے ذکر کیا کہ دنیا میں توحید کے دو قدیم و کبیر مرکز تھے۔ ایک بیت اللہ شریف اور دوسرا بیت المقدس، ہم نے یہ بھی جانا تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قریبی تعلق ان دونوں مراکز سے تھا۔ مکی مرکز کی آپ علیہ السلام نے بنفس نفیس تعمیر نو کی اور اپنے بڑے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو یہاں آباد کیا۔ شامی مرکز میں آپ علیہ السلام نے چھوٹے بیٹے اسحاق علیہ السلام کو آباد کیا۔ تو جب ابراہیم علیہ السلام ان دونوں مراکز کے متولی تھے تو یقینی طور پر آپ کی اولاد ہی ان دونوں مراکز کی وراثت پانے کی حق دار تھی۔ لیکن اس ضمن میں ایک اہم بات، یاد رکھنے کی یہ ہے کہ وراثت کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ خاندانی وراثت جس کے ذریعے سے باپ دادا کی زمین و جائیداد، ان کی اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی ہے۔ اگرچہ خاندانی وراثت پر عقیدے و ملت کا فرق اثر انداز ہوتا ہے لیکن یہ خاندانی وراثت چلتی، خاندانی، خونی اور رحمی رشتوں ہی میں ہے۔ دوسری وراثت کو ہم اصولی وراثت کہتے ہیں کہ جس کا تعلق نسلی رشتے پر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق نظریاتی وابستگی سے ہے۔ تو اب پہلی بات یہ ہے کہ مسجد الحرام ہو یا بیت المقدس، یہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کی میراث تو بلا شبہ ہیں ہی لیکن یہ خاندانی وراثت میں شامل نہیں ہیں اور نہ ہی ابراہیم علیہ السلام کو یہ خاندانی طور پر ملے تھے۔ نہ تو مکے کی زمین، حضرت ابراہیم کے والد 'آزر' کی ملکیت تھی اور نہ ہی بیت المقدس کی زمین اس کی ملکیت تھی۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالی کی عبادت کے عالمگیر مراکز تھے جو ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام کی تولیت میں اللہ کے پیغمبر ہونے کے ناطے دیے گئے تاکہ وہ انھیں نمازیں پڑھنے والوں اور حج و عمرہ اور اعتکاف کرنے والوں

کے لیے صاف ستھرا رکھیں۔ تو ان مراکز و مساجد کی وراثت ایک اصولی و معنوی وراثت تھی۔ جس کے انتقال کا بالکلیہ اور سراسر، انحصار اشتراک مذہب و ملت پر ہے۔ یہاں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو — پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

جب ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے بیت الحرام کی بنیادیں اٹھاتے وقت اپنے اور اپنی اولاد کے لیے مسلمانی کی دعا مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ﴾ (البقرہ:۱۲۸) "اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا دے اور ہمیں اولاد کو بھی فرمانبردار امت بنا دے" لیکن اہل کتاب نے اپنے باپ دادا کے مسلک مسلمانی کو ترک کیا اور نادانی کا راستہ اختیار کیا ﴿وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ (البقرہ:۱۳۰) "اور وہی ملت ابراہیمی سے بے رغبتی کرے گا جو سرے سے احمق بن گیا ہو" اہلِ کتاب نے اسلام کے سایۂ عاطفت میں آنے اور اسلام کو اپنی شناخت بنانے کے بجائے اپنے از کارِ رفتہ مذاہب سے وابستہ رہنے کو نہ صرف ترجیح دی بلکہ اس کا اعلان بھی کرنے لگے۔ اللہ تعالی نے ان کی نفی کرتے ہوئے انھیں ملت ابراہیم اختیار کرنے کا حکم دیا: ﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (البقرہ:۱۳۵) "اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ راہ راست پر آجاؤ گے۔ کہہ دو کہ: نہیں بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر تھے، اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں"۔ لیکن ان عاقبت نا اندیشوں نے ملت ابراہیمی سے اعراض کے باوجود ابراہیم علیہ السلام کی مبارک شخصیت پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (آل عمران:٦٧) "نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی، بلکہ وہ تو اللہ کی طرف یکسو مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہیں تھے" اس جامع نفی نے دنیا کی ہر گمراہ قوم کو نسبت ابراہیمی سے محروم کر دیا۔ اب یہ بتانا ضروری تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا سچا نام لیوا، اور جائز وارث کون ہے تو فرمایا گیا: ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ

وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾(آل عمران:٦٨) ''بے شک تمام لوگوں میں ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ حقدار وہ تھے جنھوں نے آپ کا اتباع کیا اور یہ نبی (محمد ﷺ) اور وہ لوگ (جو آپ ﷺ پر) ایمان لائے''، اب نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت ہی ملت ابراہیم کے نگہبان اور وارث ہیں۔ دیگر کسی قوم کا منہ نہیں ہے کہ وہ آپ علیہ السلام کا نام لے سکے۔ چنانچہ اب دونوں ابراہیمی مراکز کو آپ کی تحویل میں دیا جانا ضروری ہوا۔ بیت الحرام تو حسی اور انتظامی طور پر، آپ ﷺ کی زندگی ہی میں آپ کو دے دیا گیا۔ جب کہ دوسرا مرکز، بیت المقدس اصولی طور پر آپ ﷺ کو دے دیا گیا۔ البتہ انتظامی طور پر بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھ آنے میں کچھ وقت لگا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اہل کتاب کی تولیتِ قدس سے محرومی کے کچھ مزید دلائل

اس بابت اصولی بات تو عرض کر دی گئی لیکن چند مزید چیزیں بھی سامنے لائی جا رہی ہیں تاکہ ''کوئی فتنہ گر'' مسلمانوں کو اس مسئلے میں گمراہ نہ کر سکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ نے امام الناس کے رتبے پر فائز کیا اور فرمایا:﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ ''بے شک میں آپ کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہو'' اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جناب باری تعالی میں عرض کی کہ کیا یہ وعدہ میری اولاد کے ساتھ بھی ہے؟ تو اللہ نے فرمایا:﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرہ:١٢٤) ''میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا'' اللہ تعالی کے احکام کو توڑنا بھی ظلم ہے اور اس باب میں اہل کتاب کے جرائم کی فہرست طویل ہے لیکن اللہ تعالی کی توحید کو شرک سے آلودہ کرنا ظلم کی وہ قسم ہے جس میں کسی قسم کی معافی کی گنجائش نہیں ہے اور اس حوالے سے اہلِ کتاب بدترین ظلم کے مرتکب ہوئے:﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾ (التوبہ:٣٠) ''اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاری نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، یہ تو ان کے مونھوں کی باتیں ہیں، یہ تو اپنے سے پہلے والے کافروں جیسی باتیں کرنے لگے ہیں، اللہ ان کی گردن مارے کہاں سے پھرائے جا رہے ہیں'' کفر و شرک کے مرتکب ہو کر اہل کتاب ظالموں میں شامل ہوئے تو اب ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے خدائی

وعدے میں سے خارج ہو گئے۔

اگرچہ بعض جدید مسلمان اہل کتاب کو کافر کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں لیکن اللہ تعالی نے سورۂ بینہ میں اُن کے کفر کا پول کھولا ہے: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ (البینہ:۱) ”نہ تھے باز آنے والے جنھوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور مشرکوں میں سے یہاں تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آجاتی“ لیکن ظاہر ہے وہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو اسی سورت میں ان کی اوقات دکھلا دی گئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ (البینہ:٦) ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور مشرکوں میں سے وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بد ترین خلائق ہیں“ تو یہ بد ترین خلائق کافر، اسلام کے مرکز اور نبیوں کی وراثت بیت المقدس پر متمکّن کیسے رہ سکتے ہیں؟

اہلِ کتاب کی تولیتِ بیت المقدس سے محرومی پر درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے: ﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللهَ فَعَسَى أُولَئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ﴾ (التوبہ:۱۶ تا ۱۸) ”مشرکین کے لائق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں، خود پر کفر کی گواہی دیتے ہوئے، ان کے تو اعمال اکارت چلے گئے اور وہ ہمیشہ کے دوزخی ہیں۔ بے شک مساجد کو تو وہ آباد کر سکتے ہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور وہ نماز قائم کرے اور زکاۃ ادا کرے اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت یافتوں میں ہو جائیں“۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ الواحدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے: دلت عَلَى أَنَّ الْكُفَّارَ مَمْنُوعُونَ مِنْ عِمَارَةِ مَسْجِدٍ مِنْ مَسَاجِدِ الْمُسْلِمِينَ ”آیت دلالت کرتی ہے کہ کفار کے لیے مسلمانوں کی کسی بھی مسجد کی تولیت جائز نہیں ہے“، تو جب اہلِ کتاب ایمان نہ لائے بلکہ کافر ہوئے تو وہ بیت المقدس کی تولیت سے محروم ہو گئے اس لیے کہ کفر پر رہتے ہوئے کوئی کسی عام مسجد کا متولی بھی نہیں بن سکتا کجا یہ کہ وہ حرم

مقدس کا رکھوالا ہونے کا دعوی کرے! ایک گناہ اور بھی ہے جس کا مرتکب نہ صرف کہ مساجد کی تولیت بلکہ ان میں آزادانہ نقل و حرکت سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے اور وہ جرم ہے مساجد میں اللہ کے ذکر و عبادتِ صحیح میں رخنہ اندازی کرنا: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (البقرۃ:۱۴) ”اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد سے روکے کہ وہاں اللہ کا ذکر کیا جائے اور وہ کوشش کرے ان مساجد کے اجاڑنے کی ان لوگوں کے لیے جائز ہی نہیں کہ وہ ان مساجد میں داخل ہوں مگر یہ کہ خائف ہو کر“ ان آیات کے شان نزول میں مفسرینِ صحابہ و تابعین کے ہاں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض کے نزدیک مساجد میں ذکر اللہ سے روکنے والوں سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ علامہ وہبۃ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ ایک اصولی بات لکھتے ہیں: العِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لا بِخُصُوصِ السَّبَبِ، فتَشْمُلُ أَهْلَ الْكِتَابِ ومَنْ على شَاكِلَتِهِم (التفسیر المنیر) ”چوں کہ خصوصی سببِ نزول کے بجائے عمومی الفاظ سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے پس اس آیت کا اطلاق اہل کتاب پر بھی ہوتا ہے اور تمام ان لوگوں پر بھی کہ جو ان کے راستے پہ چلے“ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَظَاهِرُ الآيَةِ الْعُمُوْمُ في كُلِّ مَانِعٍ وفي كُلِّ مَسْجِدٍ وخُصُوْصُ السَّبَبِ لا يَمْنَعُه (روح المعانی) ”ظاہر آیت میں عموم پایا جاتا ہے، ہر مانع ذکر، اور ہر مسجد اس حکم میں داخل ہے اور شان نزول یہ معنی مراد لینے میں مانع نہیں ہے“ پس مندرجہ بالا اصول کے تحت مشرکین مکہ، یہود اور نصاریٰ تینوں گروہ اس آیت کے حکم میں داخل ہیں۔ اور یہ ساری قومیں اپنے اپنے وقت میں اس جرم عظیم کی مرتکب رہ بھی چکی ہیں۔ نیز بیت اللہ شریف اور بیت المقدس سمیت تمام مساجد اس حکم میں شامل ہیں۔ اسی لیے علامہ وہبۃ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ نے صلیبی جنگ جوؤں اور یہود عصر حاضر کو بھی آیات مذکورہ کے تحت داخل کیا ہے۔

مساجد کی آباد کاری سے کیا مراد ہے تو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: وَلَيْسَ الْمُرَادُ مِنْ عِمَارَتِهَا زَخْرَفَتَهَا وَإِقَامَةَ صُورَتِهَا فَقَطْ، إِنَّمَا عِمَارَتُهَا بِذِكْرِ اللهِ فِيهَا وَإِقَامَةِ شَرْعِهِ فيها، وَرَفْعِها عَنِ الدَّنَسِ والشِّرْكِ (تفسیر

ابن کثیر)''اس سے مراد عمارتوں کی بناوٹ نہیں ہے بلکہ آباد کاری سے مراد ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی شریعت پر عمل کیا جائے اور ظاہری نجاست اور (باطنی نجاست) شرک سے اسے پاک رکھا جائے''اس اصول کی روشنی میں اللہ کی مسجدوں کی ویرانی سے مراد ہوگا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے روکا جائے۔ چونکہ آباد کاری میں شریعت کے مطابق عبادت کرنا بھی داخل ہے تو حاملین شریعت کو یہاں داخل ہونے سے روکنا بھی مسجد کی ویرانی میں داخل ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اللہ کی عبادت علی وجہ الصحیح موقوف ہوجاتی ہے۔

اللہ کے ذکر سے روکنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اہلِ ایمان کی عبادتِ صحیح کے ساتھ ساتھ، اہلِ کفر کی عبادتِ غیر صحیح کو بھی جاری کیا جائے جو کہ جائز نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کے داخلہ حرم اور حج پر پابندی لگا دی تھی۔ حالانکہ وہ اللہ کا نام لیا کرتے اور اللہ کی عبادت مثلاً طواف وغیرہ بھی کرتے تھے۔ بہرحال، مندرجہ بالا تمام صورتوں کے اعتبار سے، اہلِ کتاب، بیت المقدس کی ویرانی اور اللہ کے ذکر سے روکنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اس کی تولیت کے لیے نا اہل ثابت ہوتے ہیں، مندرجہ بالا آیت کے آخری الفاظ ﴿أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلا خَائِفِين﴾ سے بھی یہی مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

هَذَا خَبَرٌ مَعْنَاهُ الطَّلَبُ، أَيْ لَا تُمَكِّنوا هَؤُلَاءِ إِذَا قَدَرْتم عَلَيْهِمْ مِنْ دُخُولِهَا إِلَّا تحْتَ الْهُدْنَةِ وَالْجِزْيَةِ(تفسیر ابن کثیر)''یہ حکم ہے جو کہ جملۂ خبریہ کے انداز میں دیا جا رہا ہے مطلب یہ کہ مسجدوں کو ویران کرنے والوں کو مسجدوں پر اختیار نہ دو اگر تم اس کی قدرت رکھتے ہو تو، البتہ صلح اور جزیہ کے تحت داخل ہوسکتے ہیں''حضرت کعب الاخبار اور سُدی رحمہا اللہ کی رائے یہ تھی کہ آیت ہذا میں مساجد کو ویران کرنے والوں سے مراد نصاریٰ ہیں اور مسجد سے مراد بیت المقدس ہے۔ ان دونوں کے اقوال کا حاصل بھی یہی ہے کہ نصاریٰ بیت المقدس کی تولیت بلکہ آزادانہ آمد و رفت کے بھی حقدار نہیں ہیں سوائے یہ کہ جزیہ ادا کر کے داخل ہوں''(تفسیر ابن کثیر) موجودہ وقت میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ سے مسلمانوں کو روکنے یا غیر اہل لوگوں کے داخلے اور ان کی غیر مشروع طریقے پر عبادت کو جاری کرنے کی کوشش کرنے والوں میں تینوں گروہ شامل ہیں۔ یہود تو عملاً اس کوشش میں ہیں جب کہ عیسائی حکومتیں ان کی سرپرست اور مشرکین ان کے حمایتی ہیں۔ تو

اس جرم کی وجہ سے اہل کتاب کا کوئی بھی گروہ مسجد الاقصی کا متولی نہیں ہو سکتا۔

بیت المقدس کے جائز متولی صرف مسلمان ہیں

یہود و نصاری کے حقِ تولیتِ بیت المقدس سے محرومی کے لیے بیان کیے گئے دلائل سے مسلمانوں کی تولیت کا ثبوت از خود ہو جاتا ہے۔ مساجد کی تولیت کے حقدار لوگوں کی جو صفات مثلا، صاحب ایمان ہونا، نماز اور زکاۃ کی ادائی کا اہتمام کرنا، اللہ کی شریعت کے مطابق عبادت بجالانا وغیرہ، بیان کی گئیں ان صفات کی حامل صرف امتِ مسلمہ ہی ہے۔ مسجدِ اقصی پر مسلمانوں کی تولیت کا ایک ثبوت تحویلِ قبلہ کے واقعے میں ہے۔ نبی کریم ﷺ مدینہ میں آکر سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے، اس کے بعد اللہ کے حکم سے بیت المقدس کی جگہ بیت الحرام کو قبلہ مقرر کردیا گیا۔ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے میں اشارہ یہ ہے کہ یہ قبلہ بھی اب مسلمانوں کا ہے اور پھر بیت الحرام کو قبلہ بنانے میں اشارہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی جگہ اب آل اسمعیل، اللہ کی نمائندگی پر سرفراز ہو رہی ہے اور سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو اب اس منصب سے محروم کیا جارہا ہے:﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً﴾ (البقرہ:۱۴۳)" اور اسی طرح ہم نے تم کو بنایا بہترین امت تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور، رسول گواہ ہو جائیں تم پر"، تو اللہ کی نمائندہ امت کے منصب سے محرومی کی وجہ سے اہل کتاب، بیت المقدس کی تولیت سے محروم کردیے گئے اور اسی منصب نمائندگی پر فائز ہونے کی وجہ سے مسلمان امت، بیت الحرام اور بیت المقدس یعنی دونوں قبلوں کی تولیت کی حقدار قرار پائی۔

معراجِ رسول ﷺ اور بیت المقدس

معراج کے واقعے سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے پاس آنے والی ہے۔ اسی کی تمہید کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو معراج کا سفر براستہ بیت المقدس کرایا گیا:﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾

(الاسراء:۱) ”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجدِ اقصی تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے“۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: ”نبی کریم ﷺ کو وہاں لے جانے میں یہ بھی اشارہ ہو گا کہ جو کمالات انبیاے بنی اسرائیل وغیرہ پر تقسیم ہوئے تھے آپ کی ذاتِ مقدس میں وہ سب جمع کر دیے گئے، جو نعمتیں بنی اسرائیل پر مبذول ہوئی تھیں، ان پر اب بنی اسماعیل کو قبضہ دلایا جانے والا ہے۔ ”کعبہ“ اور ”بیت المقدس“ دونوں کے انوار و برکات کی حامل ایک ہی امت ہونے والی ہے“۔

جب آپ ﷺ بیت المقدس میں اپنی سواری سے اترتے ہیں تو اس کے بارے میں بیان فرماتے ہیں: ((فَرَبَطْتُهُ بِالْحَلْقَةِ الَّتِي يَرْبِطُ بِهِ الْأَنْبِيَاءُ)) ”میں نے اپنی سواری اسی کڑے سے باندھی جس سے انبیاے کرام اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے“۔ مسندِ احمد کی روایت کے مطابق صحابہ کرام بیان کرتے ہیں: ((فَلَمَّا دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَسْجِدَ الْأَقْصَى قَامَ يُصَلِّي، ثُمَّ الْتَفَتَ فَإِذَا النَّبِيُّونَ أَجْمَعُونَ يُصَلُّونَ مَعَهُ)) (مسند احمد) ”پس جب نبی کریم ﷺ مسجدِ اقصی میں داخل ہوئے تو آپ نماز پڑھنے لگے پھر جب آپ نے نماز ختم کر کے مڑے تو دیکھا کہ تمام انبیاے کرام آپ ﷺ کے ساتھ شریک نماز ہیں“، نبی اکرم ﷺ کے اپنے الفاظ میں امامت کا ذکر موجود ہے اور یہ امت کی متفقہ رائے ہے کہ آپ ﷺ نے انبیاے کرام کو جماعت کرائی تھی: ((فَحَانَتِ الصَّلَاةُ فَأَمَمْتُهُمْ)) (صحیح مسلم) ” نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے ان کی امامت کی“ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: لَقِيَهُمْ بِبَيْتِ الْمَقْدِسِ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَأَمَّهُمْ نَبِيُّنَا ﷺ (فتح الباری) ” آپ ﷺ ان سے بیت المقدس میں ملے اور نماز کا وقت ہو گیا تو آپ ﷺ نے ان کی امامت کا شرف حاصل کیا“ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی امامت کے بارے میں لکھتے ہیں ” حضور ﷺ کو جو سیادت و امامتِ انبیا کا منصب دیا گیا تھا اس کا حسی نمونہ آپ کو اور مقربین بارگاہ کو دکھلایا گیا“۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کی جانے والی امامت ان کی پوری امت میں چلتی لیکن جب آپ اولاد کے ایک حصے یعنی یہود و نصاری نے

اپنے جدِ امجد کے مذہب و مسلک کو ترک کر دیا تو اپنی اس بے وفائی کے سبب وہ اس وراثت عظمی سے محروم کر دیے گئے۔ اب وراثتِ ابراہیمی اور امامتِ قبلتین کا منصب، اولادِ ابراہیمی کے دوسرے حصے کی طرف منتقل ہوا، اور نبی کریم ﷺ اس حصے کے رسول کی حیثیت میں امامِ قبلتین کہلائے اور آپ کے بعد یہ منصبِ امامت صحیح طور پر آپ کی امت کو منتقل ہوا، اور آپ کے وسیلے سے اب امتِ محمدیہ ہی قبلۂ اول اور مرکزِ توحید بیت المقدس کی جائز متولی ہے۔ بیت المقدس سے امتِ محمدی کے خصوصی تعلق کو مختلف احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى وَمَسْجِدِي هَذَا)) (متفق علیہ) "شدِ رحال (بہ غرض خصوصی عبادت سفر) نہ کیا جائے گا مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد الحرام، مسجد الاقصی اور میری اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) کی طرف"۔ اس حدیث میں، ایک اعتبار سے مسجدِ اقصیٰ کو حرمین شریفین کے برابر کیا گیا کہ عبادت سمجھ کر اس کی طرف سفر اختیار کرنے کی اجازت دی گئی حالانکہ یہ حیثیت کہ سفر ہی عبادت بن جائے ان تین کے علاوہ کسی مقام کو حاصل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بعض علمائے کرام مسجدِ اقصیٰ کو تیسرا حرم قرار دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں مسجدِ اقصیٰ کی طرف سفر کرنے کو مغفرت کا ذریعہ بتایا گیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب سلمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیرِ (مکرر) سے فارغ ہوئے تو آپ نے اللہ تعالی سے تین چیزوں کی دعا مانگی: ((حُكْمًا يُصَادِفُ حُكْمَهُ وَمُلْكًا لاَ يَنْبَغِي لأَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ وَأَلاَّ يَأْتِيَ هَذَا الْمَسْجِدَ أَحَدٌ لاَ يُرِيدُ إِلاَّ الصَّلاَةَ فِيهِ إِلاَّ خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) (سنن نسائی) "فیصلہ و اجتہاد کی ایسی صلاحیت جو اللہ کے حکم کے موافق فیصلہ کرے، ایسی بادشاہی جو میرے بعد کسی کو نصیب نہ ہو اور یہ کہ جو شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی نیت سے آئے تو وہ گناہوں سے اس دن کی طرح صاف ہو جائے جب اسے اس کی ماں نے جنا تھا" نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: ((أَمَّا اثْنَتَانِ فَقَدْ أُعْطِيَهُمَا وَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ قَدْ أُعْطِيَ الثَّالِثَةَ)) "پہلی دو چیزیں تو آپ کو دے دی گئیں (جو عالمِ واقع میں نظر آتی رہیں) جہاں تک تیسری کی بات ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ بھی اللہ نے قبول کر لی ہوگی" اس حدیث میں نماز کی نیت سے مسجدِ

اقصی کا سفر کرنے کی مشروعیت بلکہ استحباب اور اس امر کا اسبابِ مغفرت میں سے ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسبابِ مغفرت کو حاصل و اختیار کرنا چونکہ شریعت کے پسندیدہ امور میں سے ہے ۔ لہذا، اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کا اختیار ہونا چاہیے تاکہ مسلمان آسانی سے اس کی زیارت وعادت کا اہتمام کر سکیں۔

مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا خصوصی اجر بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِي بِأَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ))(فتح الباری بحوالہ مسند البزار)'' مسجدِ حرام کی نماز (عام مساجد کی ایک لاکھ نماز کے برابر ہے اور میری اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں ایک نماز ادا کرنا عام مساجد کی ایک ہزار نماز کے برابر ہے اور مسجدِ اقصیٰ کی ایک نماز عام مساجد کی پانچ سو نماز کے برابر ہے''۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نماز کی نیت سے مسجدِ اقصیٰ کا سفر کیا کرتے تھے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ مسجدِ اقصی کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس میں نماز ادا کریں بہت سارے لوگ بھی آپ کے پیچھے چلے تو آپ نے پوچھا تم کاہے کو میرے ساتھ چلتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: چونکہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت پائی ہے لہذا ہم پسند کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ چلیں اور آپ پر سلام پیش کریں (اور جواب میں آپ کا سلام ملے)، جب وہ مسجدِ اقصی پہنچ گئے تو انھوں نے حکم دیا کہ ''اترو اور نماز ادا کرو'' چنانچہ سب اترے اور حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے نماز ادا کی اور ان لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی (مسند احمد)

حج کے ضمن میں بھی بیت المقدس کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:((مَنْ أَهَلَّ بِحَجَّةٍ أَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ أَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ)) (ابو داود)'' جس نے مسجدِ اقصی سے حج یا عمرے کا احرام باندھ کر لبیک کہا تو اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے یا اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی''۔

اس حدیث پاک میں بیت المقدس سے جا کر حج اور عمرے کا احرام باندھنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اسلاف میں سے کئی بزرگوں کا یہ عمل رہا ہے کہ وہ پہلے بیت المقدس جاتے اور وہاں سے پھر حج یا عمرے کے لیے روانہ ہوتے۔ لیکن افسوس کفار کے قبضے کی وجہ سے اب مسلمان اس سعادت سے محروم ہیں۔ اس حدیث سے اشارت ہوتی ہے کہ اگر قوت جمع کر کے اسی طرح بیت المقدس کو پنجۂ یہود سے آزاد کرانا چاہیے جس طرح کبھی بیت اللہ شریف کو کافروں کے چنگل سے چھڑایا گیا تھا۔ تاکہ مسلمان اپنا سفرِ حج تینوں حرمین تک پھیلا سکیں۔

جاری ہے

انور غازی

معروف کالم نگار

چودہ اگست کا اصل پیغام خصوصی

اگست ایک مرتبہ پھر آیا ہے، اور جن حالات میں آیا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ دیکھیں! اصول، ضابطہ، قانون، طریقہ کار، اور رواج و دستور یہی چلا آرہا ہے کہ کوئی بھی ملک، شہر، ادارہ، گھر، کمپنی وغیرہ بنانا بڑوں کا کام ہوتا ہے، لیکن اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا ان کے بعد آنے والی نسلوں کا کام ہوتا ہے۔ پاکستان ہمارے آبا و اجداد نے خون کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ ہمارے باپ دادا نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں دشمنوں کے ٹینکوں تلے اپنی جانیں دے کر پاکستان بچایا۔ میرے بھائیو! پاکستان صرف حکمرانوں کا نہیں بلکہ ہم سب پاکستانیوں کا گھر ہے۔ جب پاکستان ہم سب کا گھر ہے تو پھر اس کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں سمیت ہر قسم کی حفاظت بھی ہمارے ذمے داری ہے۔ اگر بنظر غائر جائزہ لیں تو اس وقت پاکستان پر ہر طرف سے اور ہر لحاظ سے دشمن کی یلغار ہے۔ استعماری طاقتیں پاک وطن کو کمزور کرنا چاہتی ہیں۔ اسی وجہ سے ملک میں قومیت، عصبیت، صوبائیت، لسانیت اور فرقہ واریت کو فروغ دلوایا جارہا ہے، جس کی وجہ سے پورے ملک میں انتشار، انارکی، بدامنی، خوف، بے یقینی اور افراتفری کی فضا ہے۔ ایسے حالات میں مدارس، علمائے کرام، صوفیائے عظام، محراب و منبر سے وابستہ افراد، جج صاحبان، وکلا برادری، صحافیوں، دانشوروں، اسکالروں، کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ، قانون نافذ کرنیوالے اداروں، صنعت کاروں، سیاستدانوں، مزدوروں، سول سوسائٹی کے لوگوں... گویا ہر محب وطن

پر لازم ہے کہ وہ پاک وطن کے خلاف ہر قسم کی سازش کو باہم متحد ہو کر ناکام بنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس کی حفاظت کرے۔ اس کی قدر کرے۔ اس کے بکھرے ہوئے گیسو سنوارے۔ ریاستِ مدینہ کے بعد اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اسی میں ہم سب کی بقا ہے۔ یہی قوم کی اپنے وطن کے ساتھ وفاداری ہے اور ہمارا دین بھی یہی درس دیتا ہے۔ ملک و ملت کے ساتھ یہی وفاداری کا تقاضا ہے۔ پاک وطن کے گھمبیر اور مشکل ترین حالات کا حل بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اس ۱۴/ اگست کا اصل پیغام یہی ہے۔ قارئین! بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ "تحریکِ آزادی میں علما کا کوئی کردار نہیں ہے"۔ یہ بات حقائق کے منافی ہے۔ علمائے کرام نے آزادی کی تحریک میں بڑھ کر حصہ لیا تھا، چند ایک کے نام پیش کیے دیتا ہوں تاکہ سند رہے۔ یادش بخیر! ۱۶۰۰ء کے بعد انگریز برصغیر میں داخل ہوا اور یہاں کی آزادی پر ڈاکہ ڈالا گیا، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا۔ تحریک کی کمان سید احمد رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور بے شمار علاقوں میں انگریز کو شکست دی۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہما بالاکوٹ کے مقام پر بے شمار رفقا کے ہمراہ شہید ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا اہم ترین معرکہ "شاملی" کے میدان میں ہوا، جہاں انگریز کو سخت جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکے کے سپہ سالار حاجی امداد مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کے خاص کمانڈروں میں حافظ محمد ضامن، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم جیسے جلیل القدر علما تھے۔ اس معرکے میں بے شمار علما و طلبہ شہید ہوئے۔ مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علما کو فتویٰ جہاد کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ مفتی کفایت علی کافی بدایونی کو جنگ آزادی کی پاداش میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر نے اسلامی روایت کے تحفظ اور ملک کی آزادی کی خاطر ۱۸۶۶ء میں قصبۂ دیوبند میں "دارالعلوم" نامی علمی درس گاہ کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر آزادی کی تحریکوں کا مرکز و سرچشمہ ثابت ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے آزادی کے لیے "تحریک ریشمی رومال" شروع کی۔ ۱۹۱۷ء میں غداری کی وجہ سے حجازِ مقدس سے شیخ الہند کو گرفتار کر کے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا وحید احمد

رحمۃ اللہ علیہم کے ہمراہ بحیرہ روم میں واقع جزیرۂ مالٹا کی جیل میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی جوہر نے انگریزوں کے خلاف تحریکِ خلافت شروع کی۔ مولانا شوکت علی اور ابوالکلام آزاد جیسے عظیم قائدین بھی ساتھ تھے۔ مفتی محمد شفیع اور سید ابو محمد دیدار علی شاہ الوری نے ''مطالبۂ پاکستان'' کو مدلل فتاویٰ کی صورت میں پیش کر کے تحریک آزادیٔ پاکستان میں فیصلہ کن اور موثر ترین کردار ادا کیا۔ مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے مطالبہ پاکستان کی پرزور حمایت کا اعلان کیا۔ شاہ احمد نورانی کے والد ماجد عبد العلیم صدیقی قادری نے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو عالمی سطح پر اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مفتی محمد شفیع، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا عبد الحامد بدایونی اور مولانا عبد الستار خان نیازی نے مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے نتیجہ خیز کاوشیں سرانجام دیں۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جبکہ مشرقی پاکستان مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوتِ قرآن اور دعا کے بعد پاکستان کی پہلی پرچم کشائی کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب بانیٔ پاکستان قائد اعظم کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی نماز جنازہ کی امامت فرمائی۔ تدفین کے سارے مراحل سرانجام دیے۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے ''قراردادِ مقاصد'' کے عنوان سے قرارداد منظور کی تو اسلام کی بنیادی تعلیمات، اساسی احکامات اور اہم جزئیات کو آئین کا حصہ بنانے میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقائے کار نے بھرپور کردار ادا کیا، اور آج بھی علمائے کرام ملک کی تعمیر و ترقی اور قوم کی فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

(آن لائن روزنامہ جنگ، مراسلات ۱۴/ اگست ۲۰۱۷)

*****

مفتی نذیر احمد ہاشمی
رئیسِ شعبہ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

القاعدة الثالثة: المشقة تجلب التيسير (١)

مشقت آسانی کولاتی ہے، یعنی مشکلات سہولت کا سبب بن جاتی ہیں اور تنگی کے موقعے پر توسیع دی جاتی ہے۔ اس قاعدے پر بہت سے فقہی احکام مبنی ہیں۔ مثلاً قرض، حوالہ، حجر وغیرہ۔ فقہا نے مختلف احکامِ شرعیہ میں جو بھی رخصت یا تخفیف جائز قرار دی ہے، وہ سب اسی قاعدے پر مبنی ہیں۔ مشقت کا لغوی معنٰی: جہد، مشقت اور ثقل ہے۔ شقّ يشقّ شقّا یہ اس وقت کہا جاتا ہے، جب کوئی کام کرنے والے پر بوجھ بن کر اس کو تھکا دے۔ اور درج ذیل آیت کریمہ میں بھی یہی معنی مراد ہے: ﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ﴾ (القصص:۲۷) ”میں تم پر مشقت نہیں ڈالنا چاہتا“۔ اسی طرح اس حدیث شریف میں مذکور مشقت کا یہی معنی مراد ہے: ((لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ)) (أخرجه البخاري في كتاب الجمعة، باب السواك يوم الجمعة) ”اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا“۔ شق بفتح الشين الخرق الواقع في الشيء کسی بھی چیز میں پڑنے والا شگاف: ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الأَرْضَ شَقًّا﴾ (عبس:۲۶) ”پھر ہم نے چیرا زمین کو پھاڑ کر“۔

شق بکسر الشين: (۱) الجزء: کسی چیز کا ٹکڑا: فرمان نبوی ہے: ((اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ)) ”دوزخ سے بچنے کی

کوشش کرو چاہے کھجور کا ٹکڑا ہی (صدقہ کرکے)(صحیح بخاری)

(۲) زحمت، تکلیف: ارشاد ربانی ہے: ﴿وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ (النحل:۷) ”وہ تمھارے بوجھ اٹھاکر لے جاتے ہیں (دور دراز) شہروں تک جہاں تم زحمت شاقہ کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے“۔

بضم الشين الشُّقَّةُ: وہ مقام جہاں تک پہنچنے میں مشقت لاحق ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ﴾ (التوبہ:۴۲) ”لیکن مسافت ان کو دور دراز نظر آئی“ اسی طرح وفد عبدالقیس کے مقولے میں ”شُقَّةُ“ کا یہی معنیٰ مراد ہے: إِنَّا نَأْتِيكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيدَةٍ (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الأمر بالإيمان بالله تعالى ورسوله) ہم آپ کے پاس دور دراز سے آئے۔

الشقاق والمشاقة: نزاع اور مخالفت کہ جس میں ہر فریق وہ دلائل پیش کرے، جو دوسرے کو مشقت میں ڈال دے۔ (لسان العرب، كتاب القاف، فصل الشين، 10/ 183. المصباح المنير، كتاب الشين، ص192. المفردات، ص: 459)

التيسير: یہ یسّر کا مصدر ہے اور اس کا معنیٰ سہولت، آسانی اور نرمی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر:۱۷) ”اور ہم نے قرآن مجید کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرنے والا ہو“۔

اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے: ((فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ)) (صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب صب الماء على البول في المسجد) ”تمھیں بھیجا گیا ہے درآنحالیکہ تم آسانیاں کرنے والے ہو اور تمھیں مشکل کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا“۔

(المشقة تجلب التیسیر) کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ تنگی سہولت کا سبب بنتی ہے اور تنگی کے وقت سہولت لازم ہو ہوتی ہے۔ جب مکلَّف تنگی اور شدید مشقت کا سامنا کرے، بالفاظ دیگر وہ مکلَّف بہ کے انجام دینے میں صعوبت اور غیر معتاد مشقت کا سامنا کرے تو یہ حالت ایسی سہولت کے لیے شرعی سبب بن جاتی ہے کہ جس میں اس کو مکلَّف بہ کے انجام دینے میں کوئی تنگی محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً مریض اگر قیام کی حالت میں نماز پڑھنے کی استطاعت نہ رکھے تو یہی مرض تخفیف کا سبب بن جاتا ہے اور اس کو بجائے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کا نماز پڑھنا اسی طرح صحیح اور جائز ہے، جس طرح دوران صحت کھڑے ہو کر اس کا نماز پڑھنا۔

مکلف جب بھی مشقت سے دوچار ہو تو آسانی آجاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: والذي نفسي بيده لو كان العسر في جحر، لطلبه اليسر حتى يدخل عليه... (الجامع للأحكام القرآن، 20/ 105) "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تنگی کسی سوراخ میں گھس جائے تو آسانی اسے تلاش کر کے اس کے پاس پہنچ جائے گی"۔

لیکن کیا ہر مشقت کا تیسیر میں اعتبار کیا جائے یا نہیں؟ علما نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ مشقت کی دو قسمیں ہیں: (قواعد الأحكام، 2/ 13-16. الفروق، 1/ 281-285. الموافقات، 2/ 278)

القسم الأول: المشاق غير المعتبرة: یعنی وہ مشقتیں جن کو مکلف برداشت اور ان پر مداومت کر سکتا ہے، ان کو مشتاق معتادہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً تمام عبادات اور شرعی تکلیفات کی انجام دہی میں جو مشقت ہے، وہ قابلِ برداشت ہے۔ جیسے دورانِ جہاد اپنے نفس کو خطرات سے دوچار کرنا، ایام طویلہ میں روزہ رکھنا، طلب علم میں محنت و مشقت کر کے سفر کرنا، سردی میں وضو و غسل کی مشقت، حج کے لیے سفر کی مشقت، حدود اور رجم میں لاحق ہونے والی مشقت، مجرموں اور باغیوں کو قتل کرنے کی مشقت، وغیرہ۔ المشقة تجلب التيسير والا قاعدہ مذکورہ بالا مشقتوں کو شامل نہیں۔ یہ مشقتیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ مصالح شرعیہ کے حصول کے لیے ہیں اور تکالیف شرعیہ مصالح کی قبیل سے ہیں، نہ کہ مفاسد کی قبیل

سے۔ جبکہ تکلیف نام ہے اس طلب کا جس میں مشقت ہو۔ اس لیے وہ مشقت جو نفسانی خواہشات کے خلاف ہو، وہ مشاق معتبرہ کی قبیل سے نہیں۔

القسم الثاني:المشاق المعتبرۃ یعنی وہ مشقتیں جو شریعت کی نظر میں معتبر ہیں۔ یہ وہ مشقتیں ہیں، جن سے غالبًا تکالیف شرعیہ خالی ہوتی ہیں۔ ان کی کئی اقسام ہیں:

قسم اول: وہ عظیم مشقتیں جو رسوا کرنے والی ہوں۔ مثلاً اپنی جان ضائع ہونے کا خوف یا جسم کے کسی حصے کے یا اس کے منافع کے ضائع ہونے کا خوف۔ یہ مشقتیں تخفیف اور رخصت کو واجب کرنے والی ہیں۔ کیوں کہ جان اور جسم کے کسی حصے کی حفاظت مصالح دارین کی حفاظت کے لیے اولیٰ ہے، بنسبت اس کے کہ ان کو عبادات میں ضائع کیا جائے۔ اس قسم کی مشقت جس میں انسانی جان یا اس کے کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ ہو وہی ہے جس پر قاعدہ ''المشقة تجلب التيسير'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

قسمِ ثانی: مشقت خفیفہ ہے۔ مثلاً کسی کی انگلی یا جسم کے کسی اور حصے یا سر میں درد ہونا یا طبیعت کا خراب ہونا وغیرہ۔ ان مشقتوں کا اعتبار نہیں ہے۔ شریعت نے ان کو تخفیف اور ترخیص کا موجب نہیں قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ تکالیف شرعیہ کی انجام دہی میں مصالح کا حصول اس قسم کی مشقتوں کو ہٹانے سے زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا اس قسم کی مشقتوں کو مذکورہ بالا قاعدے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر قاعدہ مذکورہ ''المشقة تجلب التيسير'' میں مذکور مشقت اس مشقت خفیفہ کو شامل نہیں۔

قسمِ ثالث: وہ مشقتیں جو شدت اور خفت میں ان دونوں کے درمیان ہیں۔ ان کے بارے میں متفقہ قاعدہ یہ ہے کہ جو ان میں سے قسمِ اول کے قریب ہیں، وہ موجبِ تخفیف اور جو قسمِ ثانی کے قریب ہیں وہ تخفیف اور رخصت کی موجب نہیں ہیں، سوائے اہل ظاہر کے مثلاً ہلکا بخار یا دانت کا معمولی درد وغیرہ۔ نوعِ اول اور نوعِ ثانی کے درمیان کی مشقتیں مختلف فیہ ہیں۔ بعض علما نے ان کو نوع اول کے ساتھ لاحق کیا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا قاعدہ 'المشقة تجلب التيسير' ان کا

احاطہ کرے گا۔ جبکہ بعض علما نے ان کو نوع ثانی کے ساتھ لاحق کیا ہے اور مذکورہ بالا قاعدہ سے ان کو مستثنی کیا ہے۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم نے سابق میں ذکر کردی کہ ان مشقتوں میں سے جو نوع اول کے قریب ہیں، وہ موجب تخفیف اور جو نوع ثانی کے قریب ہیں، وہ غیر موجب تخفیف ہیں۔ اور قاعدہ مذکورہ ان کو شامل نہیں ہے۔

قاعدہ مذکورہ 'المشقة تجلب التيسير' کی اصل

مذکورہ بالا قاعدے کا تعلق ان عظیم قواعد میں سے ہے، جو اسلام کے ایک عظیم اصل ''رفع حرج ومشقت'' کو بیان کرتی ہے۔ اس کی پشت پر بہت سارے دلائل ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ ہم سب سے پہلے وہ قرآنی آیات ذکر کرتے ہیں، جن میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے:

(۱) امت پر سے حرج کو دور کرنے پر دلالت کرنے والی آیات بینات۔

(الف)﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾(الحج:۷۸)''اللہ عزوجل نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے''۔

(ب)﴿مَا يُرِيدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ﴾(المائدة:۶)''اللہ عزوجل کا ارادہ تم پر تنگی کرنے کا نہیں ہے''۔

(ج)﴿يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾(البقرة:۱۸۵)''اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا''۔

(د)﴿يُرِيدُ اللهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾(النساء:۲۸)''اللہ تمھارے لیے تخفیف چاہتا ہے اور انسان خلقۃً کمزور ہے''۔

(۲) وہ آیات بینات جو دین میں غلو کی نہی پر دلالت کرتی ہیں۔

(الف)﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللهِ إِلَّا الْحَقَّ﴾(النساء:۱۷۱)''اے اہل کتاب! مبالغہ نہ کرو اپنے دین کی بات میں اور نہ کہو اللہ کی شان میں مگر حق بات''۔

(ب)﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾(المائدة:۷۷)"آپ ﷺ فرمادیجیے، اے اہل کتاب! غلو نہ کرو اپنے دین کی بات میں"۔

(۳)وہ آیات بینات جو مشقت، بوجھ اور قیود کی امت سے نفی پر دلالت کرتی ہیں۔

(ا)﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (البقرة:۲۲۰)" اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمھارے بھائی ہی تو ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا، اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل"۔

(ب)﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۵۷)" اس رسول یعنی نبی امی کے پیچھے چلیں جس کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے جو انھیں اچھی باتوں کا حکم دے گا، برائیوں سے روکے گا، اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے گا، اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے وہ طوق اتار دے گا جو ان پر لدے ہوئے تھے"۔

(۴)وہ آیاتِ بینات جو طاقت سے باہر چیزوں کے عدمِ تکلیف پر دلالت کرتی ہیں۔

(الف)﴿لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(البقرة:۲۸۶)" اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے"۔

(ب)﴿لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾(الطلاق:۷)ترجمہ:"اللہ کسی پر تکلیف نہیں

ڈالتا مگر اسی قدر جو اس کو دیا ہے، اب کردے گا اللہ سختی کے پیچھے کچھ آسانی“۔

(۵)وہ آیات بینات جو ضرورت کے وقت محظورات کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

(الف)﴿قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾(الانعام:۱۴۵)

”آپ فرمادیجیے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ پروحی کی جاتی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ، جس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار ہو جائے نہ نافرمانی کرے نہ زیادتی کرے تو تیرا رب بڑا معاف کرنے والا ہے، نہایت مہربان ہے“۔

اب ملاحظہ کیجیے وہ احادیث جو اسلام کے دین یسیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱)((إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ))(صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب الدين يسر)بے شک دین آسان ہے اور کوئی دینی کاموں میں عرق ریزی سے کام لے گا تو وہ عاجز اور دین اس پر غالب آجائے گا، تو تم اعمال میں توسط اختیار کرو اور اگر اکمل پر عمل نہ کر سکو تو جو اس کے قریب ہو، اس پر عمل کرو، عمل دائم پر ثواب کی بشارت حاصل کرو اور دین کے اول وآخر کی عبادت پر مداومت سے اور کچھ رات کی عبادت سے مدد حاصل کرو۔

(ب)((أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ الحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ))(صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب الدين يسر)”اللہ کے نزدیک سب سے محبوب ترین دین آسان اور دین حنیف ملت ابراہیم ہے، نہ کہ یہودیت ونصرانیت“۔

وہ احادیث جو تیسیر، تبشیر کے امر اور دونوں کی ضد سے نہی پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱)قال النبي ﷺ:((يَسِّرُوا وَلاَ تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلاَ تُنَفِّرُوا))(صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب قول النبي ﷺ يسروا ولا تعسروا)”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آسانیاں پیدا کرو اور لوگوں کو تنگی میں نہ ڈالو، خوشخبریاں سناؤ

اور متنفر نہ کرو"۔

(ب)رسول اللہ ﷺ نے ابو موسی اشعری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے فرمایا:((يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا...))(صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب قول النبي ﷺ يسروا ولا تعسروا)"تم دونوں آسانیاں پیدا کرو، تنگی نہ کرو، خوشخبریاں سناؤ لوگوں کو متنفر نہ کرو"۔

(ج)حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ:((مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ))(متفق عليه)"میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، جس کام سے میں تم کو روک دوں، اس سے رک جاؤ، اور جن کاموں کا تمھیں حکم دوں، تو اس کو اپنی استطاعت بھر انجام دو۔ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرت سوالات اور انبیاے کرام سے اختلاف نے ہلاک کر دیا۔

مندرجہ بالا آیات بینات اور احادیث مبارکہ سے واضح ہوا کہ شریعت کے پیشِ نظر انسانوں کے لیے آسانی اور سہولت پیدا کرنا ہے۔ پھر ہر قسم کی سہولتیں اور تخفیفیں جو شریعت کی طرف سے عطا کردہ ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم وہ ہیں جو محض آسانی کے لیے شریعت مطہرہ نے مقرر کی ہیں۔

دوسری قسم وہ ہیں جو عوارض کے عارض ہونے پر عذر تصور کرتے ہوئے جائز کی گئی ہیں۔ اس قسم کو شریعت مطہرہ میں رخصت کا نام دیا گیا ہے۔

جس مقام پر جہاں کسی تخفیفی صورت پر رخصت کے کلمے کا اطلاق کیا گیا ہوگا، اس سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہوگا کہ یہاں دوسری قسم مراد ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں، جن سے مذکورہ دونوں قسموں میں واضح طور پر فرق محسوس کیا جا سکے۔

(ا)رخصتِ شرعیہ: مثلاً قرض، حوالہ، حجر(تصرفات کی بندش)، وصیت، سلم، اقالہ، شرکت، صلح، عاریت، ودیعت، رہن، ضمان، ابراء، اجارہ، مزارعت، مساقات، مضاربت، وکالت، وغیرہ۔

قرض، اجارہ اور اعارہ یہ اس لیے مباح کیے گئے ہیں کہ لوگ غیر کی مملوکہ اشیا سے اپنی سہولت کے لیے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور

وکالت، ودیعت، شرکت، مضاربت، مساقات، مزارعت کی اباحت سے یہ مقصود ہے کہ انسان خود عاجز ہو تو دوسرے فرد سے اپنے معاملات میں مدد حاصل کر سکے۔

حوالہ: تاکہ دائن اپنے مدیون سے اپنا دین بسہولت کسی دوسرے ذریعے سے بھی حاصل کرنے کی قدرت رکھے۔

رہن، کفالت بالمال اور کفالت بالنفس: تاکہ دائن اپنے حق کی وصولی میں اطمینان حاصل کر سکے۔

ابراء: (کسی فرد کی تہی دستی و غربت کے پیشِ نظر پورے دین کا یا اس کے کچھ حصے کا معاف کر دینا) تاکہ ایک نادار شخص کو سہولت حاصل ہو۔ یہی علت مشتری یا بائع کے بیع میں شرط خیار کے جواز کی ہے، تاکہ اس سے پیدا ہونے والی پشیمانی کا ازالہ ہو سکے۔ بیع سلم اور بیع الوفاء ایک مفلس شخص کے نقد رقم کی ادائیگی سے عجز کے پیشِ نظر سہولت کے لیے ہے۔ خلاصہ یہ کہ دیگر اکثر احکام کا طرز اسی غرض کے تحت ہے۔

جاری ہے

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

یومِ عاشورا کا روزہ

محرم کے تین روزے رکھنے کا استحباب مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ((صوموا یوم عاشوراء، وخالفوا فیه الیهود، صوموا قبله یومًا أو بعده یومًا)) (مسند احمد) "یوم عاشورا کا روزہ رکھو، اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرتے ہوئے ایک دن قبل روزہ رکھو یا ایک دن بعد"۔ اس حدیث کو صحیح قرار دینے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے، شیخ احمد شاکر (جو مسند احمد کے محققین میں سے ہیں) نے اسے حسن قرار دیا ہے، جب کہ مسند احمد کے دیگر محققین حضرات اسے ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ((صُومُوا یَوْمَ عَاشُورَاءَ، وَخَالِفُوا الْیَهُودَ، صُومُوا قَبْلَهُ یَوْمًا، أَوْ بَعْدَهُ یَوْمًا)) علامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "ابن ابی لیلی کے سوء حفظ کی بنا پر اس کی سند ضعیف ہے، اور عطاء وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے، انھوں نے اسے ابن عباس سے موقوف روایت کیا ہے، اور اس کی سند امام طحاوی اور بیہقی کے ہاں صحیح ہے"۔ اس لیے اگر حدیث کو حسن مانا جائے تو اس کی قبولیت میں کوئی اشکال نہیں، اور اگر ضعیف ہے تو اس طرح کے مسئلے میں علمائے کرام نرمی سے کام لیتے ہیں، کیونکہ اس حدیث کا ضعف بہت تھوڑا سا ہے، نہ تو یہ موضوع ہے اور نہ ہی مکذوب۔ اور اس لیے بھی کہ یہ حدیث فضائلِ اعمال کے حوالے سے ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خاص کر محرم الحرام میں

روزے رکھنے کی ترغیب دی اور فرمایا:((أفضل الصیام بعد رمضان شهر الله المحرم))(صحیح مسلم)''رمضان المبارک کے بعد سب سے افضل روزے محرم الحرام کے ہیں''۔

امام بیہقی اور امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما سے بھی معمولی تفاوت کے ساتھ یہ روایت منقول ہے۔اس طرح یہ روایت نو، دس اور گیارہ تاریخ کے روزے کے استحباب پر دلالت کرتی ہے۔بعض علما نے گیارہ تاریخ کے روزے کے استحباب کا ایک اور سبب بیان کیا ہے یہ دس تاریخ کی احتیاط ہے،کیونکہ بعض لوگ محرم کے چاند میں غلطی کر سکتے ہیں،اس لیے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کون سا دن دس تاریخ کا تھا،اس لیے اگر کوئی مسلمان شخص نو اور دس اور گیارہ تاریخ کا روزہ رکھ لیتا ہے تو اس نے یوم عاشورا کا روزہ رکھ لیا۔امام ابن ابی شیبہ نے مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت طاؤس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ دس محرم سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد روزہ رکھا کرتے تھے،کہ کہیں دس محرم کا روزہ رہ نہ جائے۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ تین روزوں کو بدعت کہنا صحیح نہیں ہے۔لیکن اگر کوئی شخص نو محرم کا روزہ نہیں رکھ سکا تو وہ اکیلا دس محرم کا روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ مکروہ نہیں ہوگا،اور اگر وہ اس کے ساتھ گیارہ محرم کا روزہ ملالے تو یہ افضل ہے۔

*****

اجمل سراج

معروف شاعر

پاکستان کا اک مقصد تھا

یاد کرو وہ وقت کہ جب ہم،
آنکھوں میں کچھ خواب سجا کر،
خالی ہاتھوں، ننگے پیروں،
گھر سے چلے تھے،
فکر و فہم کے باب میں جس دم،
کوئی بھی ہیجان نہیں تھا،
اندیشے، خدشات نہیں تھے،
اور معدوم امکان نہیں تھا،

قول و عمل کی یکجائی کا،
ذرا بھی جب فقدان نہیں تھا،
اپنے ہدف، اپنے مقصد سے،
کوئی بھی انجان نہیں تھا،
دنیا تو تج کر آئے تھے،
دنیا کا ارمان نہیں تھا،
آج بتا دینا آساں ہے
جو اتنا آسان نہیں تھا،
پاکستان کا اک مقصد تھا،
مقصد پاکستان نہیں تھا

*****